R. N. 2200/61 Regd. No. A. 912

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone
Telegrams: "ANJUMAN"

جلد ۲۱ - شمارہ ۲۵ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - یکم جولائی سنہ ۱۹۶۲ء

سید احتشام حسین

اردو کی ابتدا — ایک وضاحت

چند دن ہوئے شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے رسالۂ اردوئے معلی کا لسانیات نمبر نکلا جس میں لسانیات، اردو زبان اور اردو زبان کی تعلیم سے متعلق چند نہایت بصیرت افروز، محققانہ اور فکر انگیز مضامین شامل ہیں۔ اس وقت جب کہ لسانیات سے دلچسپی عام ہو رہی ہے ایک ایسا علمی مجلہ نکالنے پر دہلی یونیورسٹی کا شعبۂ اردو مبارکباد کا مستحق ہے۔ اس وقت اس پر تبصرہ یا تنقید مقصود نہیں ہے، بلکہ صرف ایک مضمون اور اس کے بھی صرف ایک جزو کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔ رسالہ کے حصۂ اول کا دوسرا مضمون اردو کی ابتدا ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا نتیجۂ فکر ہے۔ یہی مضمون بہ ادنیٰ تغیر چھ، سات سال پہلے رسالہ نقوش لاہور میں اردو اور پنجابی کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ اردوئے معلی میں شائع کرتے وقت عنوان کی تبدیلی کے علاوہ ابتدائی سطروں میں بھی کچھ لفظی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ یہ بحث نہیں کہ یہی مضمون دوبارہ دوسرے عنوان سے شائع کرانا کس حد تک مناسب تھا، اس میں میرے ایک جملے کے متعلق موصوف نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کی وضاحت ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنی تالیف ہندوستانی لسانیات کا خاکہ کے مقدمہ میں جہاں اور ماہرین لسانیات سے استفادہ کیا تھا وہاں ڈاکٹر زور کی ہندوستانی لسانیات بھی پیش نظر تھی اور اردو کی ابتدا اور آغاز کے متعلق جو باتیں مجھے زیادہ مناسب اور کارآمد معلوم ہوئیں انھیں کو میں نے ایک مربوط انداز میں یکجا کر دیا۔ اپنے محدود مطالعے میں مجھے سب سے زیادہ قرین قیاس اور خیال انگیز وہ باتیں معلوم ہوئیں جو پروفیسر جیولز بلاک نے بلیٹن آف دی اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز (لندن) کے اس شمارہ میں لکھی تھیں جو سنہ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر زور کی تصنیف ہندوستانی لسانیات پہلی دفعہ سنہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ دونوں کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے یہ خیال ہوا کہ ڈاکٹر زور کا نقطۂ نظر بلاک کے نقطۂ نظر سے کسی نہ کسی حد تک ضرور متاثر ہے۔ موصوف اب لکھتے ہیں کہ وہ اپنی رائے پہلے قائم کر چکے تھے اور بلاک سے ان کی ملاقات سنہ ۱۹۲۹ء کے بعد ہوئی۔ اور وہ خود ڈاکٹر زور اور محمود شیرانی کی رایوں سے متاثر ہوا۔ میرے پاس ان باتوں کے جاننے کے ذرائع نہ تھے۔ خود ڈاکٹر زور نے ہندوستانی لسانیات میں جن جدید یورپین ماہر لسانیات کا ذکر کیا ہے اس میں بلاک کا نام بھی ملتا ہے۔ اس لئے فطری طور پر مجھے یہ خیال ہوا کہ بلاک کو تقدم زمانی حاصل ہے اور ڈاکٹر زور اس کے سنہ ۱۹۳۰ء والے مضمون سے متاثر ہیں۔ سنہ ۱۹۳۲ء کی کتاب میں اس سے استفادہ کرنا بعید از قیاس بھی نہیں۔ لیکن یہ بات ڈاکٹر زور کو بڑی حیرت خیز معلوم ہوئی اور موصوف نے اپنے مضمون میں میرا ایک جملہ نقل کرنے کے بعد یہ لکھا:

"حالانکہ نہ تو بلاک نے یہ نظریہ پیش کیا اور نہ میں نے اپنی کتابوں میں اس کے کسی نظریے کی وضاحت کی۔"

اور چند جملوں کے بعد یہ بھی لکھا کہ:

"اگر یہ مضمون اس ترتیب (اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کی طرف اشارہ ہے) کے دوران میں چھپتا تو میں اس کی تائید تو یقیناً نہیں، شاید تردید ہی کرتا۔"

میری بدقسمتی یہ ہے کہ پروفیسر بلاک کے مطالعے سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ پروفیسر موصوف پنجاب اور دہلی کی بولیوں اور زبانوں کو جدید ہند آریائی کے ابتدائی دور میں ایک دوسرے سے بہت قریب سمجھتے ہیں اور اس پر زور دیتے ہیں کہ اپنی ابتدائی تشکیلی حالت میں یہ بولیاں ایک دوسرے سے بہت قریب رہی ہوں گی، کچھ زمانہ گذر جانے کے بعد ان کا فرق نمایاں ہوا ہوگا اور یہ ایک دوسرے کو متاثر کرنے کے باوجود الگ الگ سانچوں میں ڈھل گئی ہوں گی۔ مجھے یہ خیال اس لئے زیادہ صحیح معلوم ہوا کہ شورسینی پراکرت کا خطہ یا حلقۂ اثر مشرقی پنجاب اور مغربی یوپی دونوں پر حاوی نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے جب میں نے ڈاکٹر زور کے یہاں مندرجۂ ذیل جملے دیکھے تو مجھے بلاک اور زور میں ایک مماثلت نظر آئی۔ زور کی ہندوستانی لسانیات کے صفحہ ۸۷ اور ۸۸ پر مختلف وقفوں سے یہ جملے ملتے ہیں:۔

(۱) "اردو کا سنگِ بنیاد دراصل مسلمانوں کی فتح دہلی سے بہت پہلے ہی رکھا جا چکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے اس وقت تک ایک مستقل زبان کی حیثیت نہیں حاصل کی جب تک مسلمانوں نے اس کو اپنا پائے تخت نہ بنا لیا۔"

(۲) "اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارہویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی۔ مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس زبان پر مبنی نہیں ہے جو اس وقت دہلی کے اطراف اور دوآبۂ گنگ و جمن میں بولی جاتی تھی۔ کیونکہ ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت پنجاب کی اور دہلی کے نواح کی زبانوں میں بہت کم فرق تھا۔"

(۳) "موجودہ زمانے میں یہ بتانا مشکل ہے کہ کس ٹھیک ٹھیک وقت سے پنجاب کی اور نواحِ دہلی کی زبان میں فرق پیدا ہونے لگا۔ یقین ہے کہ یہ فرق مسلمانوں کے قبضۂ دہلی کے بعد سے شروع ہوا ہے۔ ابتدا میں وہ صرف ایک تدریجی غیر محسوس حرکت تھا۔ ان دونوں مقامات کی بولیوں کے درمیان ایک ایسا خلیج حائل ہو گیا کہ ایک پنجابی بن گئی اور دوسری کھڑی بولی۔ اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے نہ کھڑی بولی سے بلکہ اس زبان سے جو ان دونوں کا مشترک سرچشمہ تھی۔"

مندرجہ بالا جملے ڈاکٹر زور کے ہیں۔ اور میرے جس جملے پر موصوف کو اعتراض اور حیرت ہے وہ یہ ہے:

"پروفیسر بلاک نے جو نظریہ پیش کیا ہے اور جسے ڈاکٹر زور نے تسلیم کیا ہے وہ یہ ہے کہ ابتدا میں پنجابی اور کھڑی بولی میں صرف تدریجی فرق رہا ہوگا بعد میں ایک پنجابی بن گئی دوسری کھڑی بولی۔"

کیا کوئی شخص موصوف کے مندرجۂ بالا اقتباسات (خاص کر تیسرا اقتباس) اور میرا جملہ پڑھنے کے بعد یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے ڈاکٹر زور کو خود انھیں کے الفاظ میں پیش نہیں کیا ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ موصوف بلاک سے متاثر نہ ہوں بلکہ وہ خود ان سے متاثر ہوا ہو لیکن یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ یہ خیالات ان کے یہاں نہیں ہیں۔ اور یہ اگر ان کے سامنے آتے تو موصوف ان کی تائید نہیں، تردید کرتے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ادھر کچھ دنوں کے اندر ڈاکٹر زور کے نقطۂ نظر میں تبدیلی ہوئی ہے اور انھوں نے اردو کے آغاز میں پنجابی کے اثر پر زیادہ زور دینا شروع کیا ہے۔ اسی سے انھیں سنیتی کمار چیٹرجی اور مسعود حسین خاں سے بھی اختلاف ہے کیونکہ یہ لوگ بھی اردو کی ابتدا میں پنجابی کے اثرات کو تسلیم تو کرتے ہیں لیکن یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اردو کا آغاز پنجابی سے ہوا بلکہ یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ یہ اثرات نہ تو خالصتاً پنجابی کے تھے اور نہ اردو کی تشکیل مابعد میں ان کا زیادہ ہاتھ رہا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اطراف دہلی کی بولیوں کے درمیان اردو کا نشوونما بھی ہوا اور اس کی اصل صورت کھڑی بولی میں نکھری جو خود شورسینی پراکرت اور شورسینی اپ بھرنش کا ایک بدلا ہوا روپ تھی۔

یوں تو ڈاکٹر زور کے مضمون میں کئی باتیں بحث طلب ہیں لیکن یہاں ان کو زیر بحث لانا مقصود نہیں ہے۔ سارے مضمون کا لب لباب یہ ہے کہ سنیتی کمار چیٹرجی، مسعود حسین خاں، شوکت سبزواری، پنڈت کیفی اور راقم الحروف میں سے کسی نے بھی اردو کی ابتدا کے متعلق کوئی واضح بات نہیں کہی۔ بلکہ کوئی یورپین محققوں کی راہ پر چل کر گمراہ ہو گیا ہے اور کوئی متضاد باتیں کہہ کر الجھ گیا ہے۔ ممکن ہے ڈاکٹر زور کا یہ خیال درست ہو لیکن حیرت تو یہ ہے کہ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ غیر واضح، مبہم اور غیر نتیجہ خیز مضمون خود ڈاکٹر زور کا ہے جس کا عنوان ہے "اردو کی ابتدا" اور جس کو پڑھنے والا اسے اس امید میں شروع کرے گا کہ اس میں محض منفی باتیں یا مخالف لوگوں پر اعتراضات نہیں ہوں گے بلکہ کوئی قطعی خیال یا نظریہ پیش کیا گیا ہوگا لیکن افسوس ہے کہ اس مضمون سے اس طرح کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اور موصوف بھی اپنا مضمون اس خواہش پر ختم کرتے ہیں کہ کاش کوئی ایسی کتاب لکھی جائے جو تمام بکھرے ہوئے مواد کی چھان بین کرکے اردو کے آغاز کے متعلق کوئی صحیح نظریہ پیش کرے۔

ہماری زبان

یکم جولائی ۱۹۶۲ء

نقصان نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

ہمارے ملک میں ایک مرض بہت عام ہو رہا ہے۔ کچھ افکار و اقدار صرف ماننے کے لئے ہیں، ان پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ عمل کی دنیا کے آداب دوسرے ہیں۔ اچھے سے اچھے افکار کی پرستش کرو، مگر روزمرہ زندگی میں ان کا خون ہوتے دیکھو تو یہ سوچ کر خاموش ہو جاؤ کہ یہ تو ہونا ہی ہے۔ عملی دنیا میں دوسرا ہی قانون چلتا ہے، اس دورنگی اور دوعملی کی وجہ سے پوری ذہنی دنیا مسموم اور مریض ہو رہی ہے۔ ہم سیکولرزم کا نام لیتے ہیں اور مذہبی جنون کو روک نہیں سکتے۔ ہم جمہوریت کا کلمہ پڑھتے ہیں مگر جمہوریت کی روح پر ظلم کرتے رہتے ہیں۔ ہم سوشلزم کو نصب العین مان کر خوش ہیں اور سرمایہ داری یا اجارہ داری کے فروغ کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ ہم اقلیتوں کے ساتھ انصاف کے دعوے دار ہیں مگر اقلیتوں کے جائز مطالبات پر کان نہیں دھرتے۔ ہم سب زبانوں کو برابر سمجھتے ہیں، مگر لسانی سامراج کو ہوا دیتے رہتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ قانون سب کو برابر کا حق دیتا ہے، مگر ملازمت دیتے وقت صلاحیت، قابلیت، اہلیت کو بھول جاتے ہیں۔ اپنے صوبے، اپنی برادری، اپنے مذہب، اپنی زبان کی پاسداری کرنے لگتے ہیں۔ تعلیم گاہوں میں انسانیت، تہذیب، مساوات کا درس دیا جاتا ہے، خود استاد جو عملی زندگی کی سختیوں سے دبے ہوئے ہیں، ان پر عقیدہ نہیں رکھتے تو وہ طلبہ کے دلوں میں ان عقائد کی گرمی کیسے منتقل کر سکتے ہیں۔ انتخاب میں امیدوار کیسا ہی ہو، ووٹ تو برادری یا پارٹی کو جاتا ہے۔ پڑھے لکھے لوگ یہ کہتے ہیں کہ "چاہے امیدوار آسمان سے اترا ہو، ووٹ تو دوست کے لئے ہے" اس دورنگی کا اثر ساری زندگی پر پڑتا ہے۔ پوری قوم میں بے یقینی، احساس شکست، مایوسی، بے دلی عام ہونے لگی ہے۔ اس کیفیت کے ساتھ قوم کی ترقی کی منزل کیسے طے ہوگی۔ ضرورت ہے کہ کچھ جیالے اپنے اصولوں پر ڈٹ جائیں۔ جو کہتے ہیں وہ کریں۔ جو کر سکتے ہیں وہی کہیں۔ آسمان کی باتیں چھوڑیں، زمین پر سیدھے سبھاؤ چلنا سیکھیں۔ سیاسی معاملات میں مذہبی رشتے، ذات برادری، صوبے سے وفاداری کو دخل نہ دیں۔ قوم کے ساتھ اس طرح نہ لپٹیں جس طرح اکاس بیل ہرے بھرے درختوں سے لپٹ جاتی ہے اور اُن کی نشوونما ختم کر دیتی ہے۔ اپنے دائرے میں اپنا کام ایمانداری سے انجام دیں۔ قوم کے مرثیے کے پردے میں اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو نہ چھپائیں۔ اصول کو اپنائیں تو یہ سمجھ کر کہ یہ دو دھاری تلوار ہے اور اس سے دوسروں کے علاوہ کبھی کبھار خود بھی زخمی ہونا پڑتا ہے۔ ایسے سچے اور کھرے آدمیوں کی ملک و قوم کو اشد ضرورت ہے۔

یہ لوگ ہوا کا رخ بدل سکتے ہیں، شروع شروع میں لوگ ان کا مذاق اڑائیں گے، انھیں طرح طرح سے نظرانداز کرنے کی کوشش کریں گے، ان پر غلط الزامات لگا کر انھیں بدنام بھی کریں گے، مگر رفتہ رفتہ ان کی عزت کرنے لگیں گے اور پھر ان کے ساتھ ہو لیں گے۔ زبان کی خدمت ہو یا تہذیب کی، تعلیم کا دائرہ ہو یا رفاہ عام کا، ملازمت ہو یا تجارت، ایسے لوگ اپنے دائرے میں اصول پرستی کا بیج بو کر، ریگستان میں نخلستان کا سماں پیدا کر سکتے ہیں۔ ہاں انھیں صرف ایک چیز سے بچنا ہوگا۔ یہ اپنے اصول پر قائم رہتے ہوئے، دوسرے کے اصول کو حرف غلط نہ سمجھیں، تنگ نظری کا شکار نہ ہوں، بلکہ ہر اصول کو زندگی میں برتے جانے اور کھرے کھوٹے کے الگ ہو جانے کے روادار ہوں۔ تنگ نظری، مذہب ہو یا سیاست، تہذیب ہو یا سائنس، سب میں بری ہے، اپنے پر اعتماد سے فراخ دلی آتی ہے، اور فراخ دلی سے خیالات کے پُرامن تصادم اور افکار کے خاموش ٹکراؤ کا موقع ملتا ہے۔ پھر خیالات اور عمل میں تطبیق کی راہیں کھلتی ہیں۔ کاش ہم اس مشکل مگر صحیح راستے پر گامزن ہو سکیں۔

قاضی غیاث الدین

قاضی غیاث الدین کے اچانک اس دنیا سے رخصت ہو جانے سے ملک ایک قابل قدر قومی رہنما، ایک بالغ نظر مدبر اور اردو زبان کے ایک مخلص کارکن سے محروم ہو گیا۔ قاضی صاحب نے بہار اسٹیٹ کی سیاسی اور تہذیبی زندگی پر ایک گہرا نقش چھوڑا ہے۔ اُنھوں نے جو تعلیمی اسکیم بنائی تھی، اُس سے ممکن ہے کچھ لوگوں کو اختلاف رہا ہو، مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے اُردو بولنے والوں کو اپنے اپنے علاقے کی عملی زندگی میں پوری طرح حصہ لینے کے قابل بنایا جا سکتا ہے۔ قاضی صاحب نام و نمود کے خواہاں نہیں تھے بلکہ خاموشی سے خدمت کرنے والوں میں تھے۔ اُنھیں کی تحریک اور مالی امداد سے اخبار دورِ حیات کا اجرا بمبئی سے ہوا، جس نے تھوڑے ہی عرصے میں اُردو صحافت میں اپنی جگہ بنا لی ہے اور جس کے مضامین غور و فکر کا مطالبہ کرتے ہیں، اور پڑھنے والوں کو قومی زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا سکھاتے ہیں۔ فرد فنا ہو جاتے ہیں، اُن کا کام زندہ رہتا ہے۔ قاضی صاحب نے جن خیالات کا بیج بویا تھا اور جس طرح بہار سے چمن کی اپنے خون جگر سے آبیاری کی تھی، اس سے ہم سب کو مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے تازہ ولولہ اور ہمت ملنی چاہیے۔ یہی اُن کے علم اور کام کا بہترین اعتراف ہوگا۔

انجمن ترقی اردو ساگر

انجمن ترقی اردو شاخ ساگر کی دعوت پر حیات اللہ انصاری صاحب مدیر قومی آواز لکھنؤ تاریخ ۲۱ جون ۶۲ء کو ساگر تشریف لائے۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو کے دفتر، انجمن کی قائم کردہ لائبریری، انجمن کے مدارس شبینہ اور اردو مکتبوں کا معائنہ کیا۔ مدارس شبینہ میں پڑھنے والے طلبہ سے گفتگو کرکے ان کی ابتدائی تعلیم کی حالت کا اندازہ کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مکتبوں میں پڑھنے والے ہندو طلبہ کی اردو استعداد سے موصوف کافی متاثر ہوئے۔

انجمن ترقی اردو کے دفتر میں ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے حیات اللہ انصاری صاحب نے انجمن کی سرگرمیوں کو نیز اردو تعلیم اور لائبریری خصوصاً گشتی لائبریری کے کاموں کو سراہا۔ آپ نے مدارس شبینہ کے طریق تعلیم کو بھی بہت پسند فرمایا، اور کہا کہ کام کی موجودہ رفتار اطمینان بخش اور خوش آیند ہے اور جس سرگرمی، جوش اور خلوص کے ساتھ یہاں کام ہو رہا ہے اس سے توقع ہے کہ اردو کی ترقی کی رفتار تیز تر ہو جائے گی۔ آپ نے کہا کہ ہر جگہ قصبات دیہات اور بڑے چھوٹے شہروں کے ہر ہر طبقے میں اردو کی ترقی کے لئے اگر اسی طرح سے ٹھوس اور تعمیری کام کئے جائیں تو اردو کا مستقبل بہت شاندار ہو سکتا ہے۔ اس کام کے لئے استقلال، مستعدی، خلوص اور ایثار کی بڑی ضرورت ہے۔

حیات اللہ صاحب نے اساتذہ کو تعلیم بالغان کے سلسلے میں ہدایات دیں اور پڑھانے کا طریقہ بتایا۔ خود ایک گھنٹے تک تعلیم گھر کے شائع کردہ قاعدہ بالغان کو پڑھا کر دکھایا اور سمجھایا کہ اس طریق تعلیم سے بیس دن میں اردو پڑھنا لکھنا آسکتا ہے۔ نئے اور پرانے طریق تعلیم پر محققانہ روشنی ڈالی اور اپنے بیس سالہ تجربات کو اساتذہ کے سامنے دہرایا۔

ابتدا میں انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری جناب محمد حسین خاں نے حیات اللہ انصاری صاحب کا تعارف کراتے ہوئے ان کی ادبی اور علمی خدمات کا اور خاص طور سے اردو کے سلسلے میں ان کے کارناموں اور تعلیم سے غیر معمولی دلچسپی پر تفصیلی روشنی ڈالی۔

آخر میں مولانا محمد یٰسین نے معزز مہمانوں اور حیات اللہ صاحب کا شکریہ انجمن کی جانب سے ادا کیا۔ (سکریٹری)

جامعہ اردو کو حکومت کشمیر کا عطیہ

حکومت کشمیر نے جامعہ اردو کے عمارت فنڈ کے لئے مبلغ تین ہزار روپے کا گراں قدر عطیہ مرحمت فرمایا ہے۔ واضح رہے کہ ۳۰ اپریل ۶۱ء کو جب عالیجناب غلام محمد بخشی صاحب نے جامعہ اردو کی نئی عمارت کا افتتاح کیا تھا تو جامعہ اردو کے لئے کشمیر ہال تعمیر کرانے کا وعدہ فرمایا تھا۔ اس سلسلے میں ۲۵ ہزار روپے کا عطیہ گذشتہ سال ہی موصول ہو چکا تھا۔ بقیہ رقم اب وصول ہوئی۔ (رجسٹرار جامعہ اردو)

جامعہ ملیہ اسلامیہ کو یونیورسٹی کا درجہ

نئی دہلی ۔ ۲۰ جون مرکزی حکومت نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو مشورہ دیا ہے کہ وہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ۱۹۵۶ء کے ایکٹ کے تحت جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور گروکل کانگڑی ہردوار کو جو کہ اعلیٰ تعلیمی ادارے ہیں، یونیورسٹی بنانے کا اعلان کر دے۔

یونیورسٹی کا درجہ ان کو پہلی بار تین سال کے لئے عطا کیا جائیگا۔ جامعہ میں بی اے اور بی ایڈ کے ڈگری کورس اس وقت پڑھائے جا رہے ہیں اور گروکل میں بی اے، بی ایس سی اور ایم اے کے ڈگری کورس کی تعلیم دی جا رہی ہے۔

اس مدت کے آخر میں ان اداروں نے جو ترقی کی اس کی رپورٹ کی بنیاد پر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن ان کی مدت میں توسیع کر دے گا۔

اسی کے ساتھ ساتھ ان اداروں کو یونیورسٹی کا مستقل درجہ دینے کے بارے میں بھی غور کیا جائے گا۔

نومبر میں ظفر کی صد سالہ برسی تمام ملک میں منائی جائے گی

بنارس ۔ ۲۰ جون۔ کل ہند ظفر اکیڈمی کے نائب صدر شری کنج بہاری گپتا سابق میئر بنارس اپنا ایک ماہ کا دورہ کرنے کے بعد رنگون سے واپس آگئے ہیں۔ شری گپتا بہادر شاہ ظفر کے مزار کو دیکھنے رنگون گئے تھے۔ انھوں نے رنگون میں ہندستان اور پاکستان کے سفیروں سے بھی ملاقات کی اور بہادر شاہ ظفر کے مزار کے بارے میں بات چیت کی۔ شری گپتا نے اس سلسلے میں کچھ ایسی معلومات حاصل کی ہیں جن کا اب تک کسی کو علم نہ تھا۔

نومبر میں کل ہند ظفر اکیڈمی کے زیر اہتمام تمام ملک میں ظفر کی صد سالہ برسی منائی جائے گی۔ اس کے لئے الگ الگ کمیٹیاں بنائی جا رہی ہیں۔ ظفر کی ایک یادگار دہلی میں قائم کی جائے گی اور دوسری بنارس میں جو ایک ہال کی شکل میں ہوگی۔ اس سلسلہ میں پروگرام کی تیاری بڑے زوروں کے ساتھ شروع ہو گئی ہے۔

غیاث الدین قاضی کا انتقال

مہاراشٹر کے سابق وزیر غذا غیاث الدین قاضی ۷ جون کو حرکت قلب بند ہو جانے سے رحلت فرما گئے۔ انتقال کے وقت مرحوم کی عمر ۵۸ سال تھی۔ مرحوم نے ۱۹۲۱ء میں تحریک عدم تعاون میں حصہ لیا تھا اور کئی بار گرفتار ہوئے تھے۔ اکولہ میں وکیل کی حیثیت سے کامیاب زندگی گزارنے کے ساتھ انہوں نے صنعتی تعلقات کمیٹی کے چیرمین کی حیثیت سے مدھیہ پردیش میں مزدوروں کی اہم خدمات انجام دیں۔ مرحوم مسلمانوں کے مسائل میں بہت دلچسپی لیتے تھے اور ان کے مفادات کے امور میں مصروف رہتے تھے۔

ریاستوں کی از سر نو تنظیم کے بعد انھیں قانون اور صحت عامہ کا نائب وزیر بنایا گیا تھا۔ ۱۹۵۷ء میں وہ دوبارہ لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور سول سپلائز، ہاؤسنگ، پرنٹنگ پریس، ماہی گیری اور اوقاف کے محکمے ان کے سپرد ہوئے تھے۔

اشفاق احمد اعظمی

کنارے کنارے

یہ ندی جو صدیوں سے
یوں ہی بہتی جاتی ہے
اس ندی کے دامن میں
کچھ حسین گلابوں کے
سرخ سرخ ہونٹوں نے
بارہا پکارا ہے
مسکراتی کلیوں نے
کھلکھلاتے پھولوں نے
جوشِ دل بڑھایا ہے
دل کے گوشے گوشے میں
نت نئے خیالوں کا
دیپ جگمگایا ہے

بارہا یہیں میں نے
آہ بھر کے سوچا ہے
کیوں نہ خودکشی کرلوں
ختم زندگی کرلوں

کرکے فیصلہ اک دن
خودکشی کا
ساحل پر
دوپہر کو آیا میں
ٹھیک سامنے میرے
اک بھنور کے حلقے تھے
اور.....
اک ذرا ہٹ کر
ایک غول بچوں کا
چل رہا تھا پانی میں
دفعتاً کوئی لڑکا
پھنس کے تیز دھارے میں
ڈوبنے لگا آخر
دیکھ کر یہ منظر میں
رہ سکا نہ ساحل پر
اور اسے بچا لایا!

موت کے ارادوں کو
زندگی ندی میں نے
خودکشی ندی میں سنے

غزل

محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاء

شغلِ خاص و عام ہوکر رہ گئی — عاشقی بدنام ہوکر رہ گئی
اس جگہ وحشت بھی کام آئی جہاں — آگہی ناکام ہوکر رہ گئی
عقل جب حد سے تجاوز کر گئی — موردِ آلام ہوکر رہ گئی
زندگی بے کار و بارِ جذبِ شوق — اک حسیں الزام ہوکر رہ گئی
یاد ان کی لمحہ بھر آئی مگر — حاصلِ ایام ہوکر رہ گئی
رفتہ رفتہ سوزشِ غم کی خلش — موجبِ آرام ہوکر رہ گئی

بے خلوصِ قلب منشاء شاعری
جنسِ نافرجام ہوکر رہ گئی

سید حرمت الاکرام

ہر تلخیٔ حیات سے الجھا ہے میرا دل — آلامِ کائنات سے الجھا ہے میرا دل
ہر سانس میں لئے ہوئے اک نشۂ دوام — دنیائے بے ثبات سے الجھا ہے میرا دل
اس بات پر کہ غم سے ہے رعنائیٔ حیات — ہر لمحہ اپنی ذات سے الجھا ہے میرا دل
حالات کے افق پہ جمائے ہوئے نگاہ — کتنی تجلیات سے الجھا ہے میرا دل
شاید کہ چاہتا ہوں میں اک کنجِ عافیت — پہنائے شش جہات سے الجھا ہے میرا دل
بے مہریٔ زمانہ کا شکوہ نہ ہو سکا — رسمِ تکلفات سے الجھا ہے میرا دل

حرمت یہ ماہ و سال کی جادو طرازیاں!
حسنِ تغیرات سے الجھا ہے میرا دل

عروج زیدی

ہر قدم پہ مجھے لغزش کا گماں ہوتا ہے — چشمِ ساقی کی نوازش کا گماں ہوتا ہے
گردشِ وقت کا پہلے یہ کرم مجھ پہ نہ تھا — بندہ پرور کی سفارش کا گماں ہوتا ہے
ہم سے امڈے ہوئے آنسو نہیں روکے جاتے — اک ابھرتی ہوئی سازش کا گماں ہوتا ہے
لطفِ پیہم نہ سہی جورِ مسلسل ہی سہی — ہر توجہ پہ نوازش کا گماں ہوتا ہے
صرف تم دل کی تباہی کا سبب کیا ہوتے — بختِ ناساز کی سازش کا گماں ہوتا ہے

اکمل حیدرآبادی

تم آئے نہ یہ جانا کہ دیوانوں پہ کیا گذری — بیٹھے اپنوں میں اور سوچا نہ بیگانوں پہ کیا گذری
مزاجِ شمعِ محفل سب نے پوچھا رات بھر لیکن — کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ پروانوں پہ کیا گذری
شبِ امیدِ وصلِ یار اور پھر صبحِ مایوسی — یہ ہم ہی جانتے ہیں اپنے ارمانوں پہ کیا گذری

مشفق کوٹوی

کسی طرح تو ہو اظہارِ مدعا ان سے — میں چپ رہوں تو نظر ہم کلام ہو جائے
میں حالِ درد سناؤں تو کوئی بھی نہ سنے — وہ مسکرائیں تو اک اژدحام ہو جائے

تو التجا کو نہ شکوے کا رنگ دے مشفق
نہ یہ دعا بھی کہیں اتہام ہو جائے

مراسلات

مرزا غالب کے ثقلِ سماعت کی تاریخ

غالب کا ایک شعر ہے:

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر

اُن کی یہ گراں گوشی بڑھتی گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اُن سے باتیں کرنے کے لیے قلم کی زبان سے کام لینا پڑتا تھا۔ سید آل محمد بلگرامی ثم مارہروی کے ایک قطعۂ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا یہ ثقلِ سماعت کب اور کیونکر عارض ہوا۔ وہ قطعہ اور اس کے عنوان کی عبارت حسبِ ذیل ہے:

تاریخ کر شدن مرزا اسد اللہ خاں المتخلص بہ غالب
والمشہور بہ مرزا نوشہ دہلوی

کان بہرے مرزا نوشہ کے آہ — بیٹھے بیٹھے یک بیک کیونکر ہوئے
دوستو تاریخ اس کی غیب سے — یہ سنی میں نے کہ "غالب کر ہوئے"

سنہ ۱۲۸۳ھ

یہ قطعہ مصنف کے دیوان تواریخ (صفحہ ۱۶۴) میں شامل ہے جو مطبع نور الانوار، آرہ ضلع شاہ آباد میں ۱۲۹۵ھ میں شائع ہوا تھا۔ اس کا ایک نسخہ راقم کے کتب خانے میں موجود ہے۔

(سید مسعود حسن رضوی ادیب)

مبارز الدولہ کے اہلِ خانوادہ سے ایک گزارش

راقم سطور نظام سکندر جاہ آصف جاہ ثالث (المتوفی ۱۸۲۹ء) کے تیسرے فرزند شہزادہ میر گوہر علی خاں مبارز الدولہ (۱۷۹۵ء تا ۱۸۵۴ء) کے حالاتِ زندگی کا تحقیقی مطالعہ کر رہا ہے۔ انیسویں صدی کے نصفِ اول کے حیدرآباد کی سیاسی تاریخ میں مبارز الدولہ کی پُرشور سرگرمیاں اور ان کے انگریز دشمن جذبات ایک مستقل باب کا درجہ رکھتے ہیں۔ ۱۸۱۵ء کے ایک خون آشام معرکے سے لے کر ۱۸۲۶ء کی پٹھانوں و عربوں کی شورش سے ہوتے ہوئے ۱۸۳۹ء کی مشہور مجاہدینِ الہند وہابی تحریک میں سرگرم حصہ لے کر آخری بار مقید ہونے تک یہ حیدرآباد میں مخالفِ انگریز اور دشمنِ فرنگ عناصر کا مرکزِ نگاہ تھے۔ ان کے والد سکندر جاہ مختلف سیاسی اسباب بلکہ مصالح کے پیشِ نظر ان کے تئیں کافی سخت گیر تھے، لیکن ان کے بھائی نظام ناصر الدولہ آصف جاہ رابع (المتوفی ۱۸۵۷ء) ان کے حق میں بہت شفیق واقع ہوئے تھے۔ اگر حالات نا مساعد نہ ہوتے (جس میں خود مبارز الدولہ کی انگریزوں سے خوف زدگی اور سہل انگاری بھی شامل ہے) تو کچھ عجب نہ تھا کہ حکومت کا تختہ الٹ کر وہ آصف جاہی تاج حاصل کر لیتے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ ان ہی مبارز الدولہ کے احوال کی تفتیش کے سلسلے میں راقم نے ان کی معاصرانہ و قریبی متعاقب عہد کی معتبر دستاویزوں سے اخذ کر کے ان کی آل و اولاد کا ایک شجرہ مرتب کیا ہے۔ مطبوعہ ذرائع معلومات کی روشنی میں یہ شجرہ شہزادہ مبارز الدولہ کی چوتھی پشت یعنی ان کے سگے پوتروں میر گوہر علی و میر قادر علی اور سگی پوتریوں جمال النسا و غوث النسا کے ناموں پر مشتمل ہے۔ بایں ہمہ یہ اس اعتبار سے بالکل غیر مکمل ہے کہ اس میں ان کی حالیہ یعنی ہماری معاصر نسلوں کا کوئی ذکر شامل نہیں کیا جا سکا۔ علاوہ ازیں مذکورہ نام شہزادہ کے صرف ایک فرزند میر احمد علی خاں کی پڑپوتر اولاد کے ہیں، جبکہ شہزادہ کے دوسرے فرزندوں کی پشتوں میں اتنی تفصیلات بھی دستیاب نہ ہو سکیں اور زیادہ تر صورتوں میں فقط تعدادِ اولاد ہی معلوم ہو سکی ہے۔ راقم کو مبارز الدولہ کی موجودہ پشت تک کی تمام تفصیل حاصل کرنی ہے تاکہ ان کی اولاد کا شجرہ صحیح معنوں میں UP TO DATE بنایا جا سکے۔

اس کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ ان کے اہلِ خانوادہ سے راقم کا ربط پیدا ہو۔ اسی غرض سے راقم ہماری زبان کے ذریعے شہزادہ کے موجودہ ارکانِ خاندان سے یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ وہ براہِ کرم ممکنہ تفصیلات روانہ کر کے مشکور فرمائیں۔

مبارز الدولہ کی مذکورہ بالا سگی پوتر اولاد میر گوہر علی و میر قادر علی صاحبان اور جمال النسا بیگم و غوث النسا بیگم کی آل و اولاد میں بہت سے حضرات حیات ہوں گے جو اسناد اور معتبر خاندانی شجروں کی مدد سے درمیانی کڑیاں فراہم کر سکتے ہیں۔ اگر صرف گھرانوں کے سربراہ صاحبان نواب مبارز الدولہ تک رشتہ کی سند فراہم کر دیں تو میرے زیرِ ترتیب شجرہ میں خود اُن کے اور ان کے آبا کے اسمائے گرامی کی شمولیت کے لیے کافی ہوگا۔

شہزادہ مبارز الدولہ کو سخن گوئی سے بھی شغف تھا اور وہ گاہے ماہے شعر بھی موزوں کر لیا کرتے تھے۔ اپنے وقتوں کے استادِ سخن حضرت شمس الدین فیض سے انھیں نہ صرف شرفِ تلمذ تھا بلکہ ان سے انھوں نے فیضانِ تربیت بھی حاصل کیا تھا۔ شہزادہ نے اپنے صاحبِ دیوان جدِّ اعلیٰ نواب میر قمر الدین علی خاں آصف جاہ اول کے شعری تخلص کو اپنا تخلص قرار دیا تھا یعنی آصف۔ سالار جنگ کے مجموعۂ مخطوطات میں ایک قلمی بیاض میں ان کا کہا ہوا ایک قصیدہ ملتا ہے اور ادارۂ ادبیاتِ اردو کے ایک مخطوطے میں ان کی ایک غزل کا عمدہ انتخاب درج ہے۔ کیا عجب جو اُن کی اولاد میں سے کسی کے پاس اُن کا مجموعۂ کلام بشکلِ دیوان یا کلیات موجود ہو۔ مبارز الدولہ سے نسبی تعلق رکھنے والے صاحبزادگان اگر اپنے قدیم خاندانی کاغذات کا بنظرِ غائر جائزہ لیں تو ممکن ہے اُن کی شعری تخلیقات کے اور نمونے بھی مل آئیں۔ لہٰذا میں اس تعلق سے بھی گزارش کرتا ہوں کہ قدیم خاندانی کاغذات وغیرہ میں اس کی شافی تحقیق کر کے مجھے مطلع فرمایا جائے۔

خانوادۂ آصف جاہی کے صاحبزادگان یعنی شہزادہ مبارز الدولہ کے بھائی معاصر ارکانِ خاندان کے علاوہ میں اُن حضرات سے بھی تعاون کی درخواست کرتا ہوں جن کی تحویل و ملکیت میں اس موضوع پر کارآمد اور مستند مواد ہو۔ توقع ہے تمام متعلقہ حضرات اس خصوص میں توجہ فرمائیں گے اور ایک علمی و تحقیقی کام میں حتی الوسع تعاون کریں گے جس کے لیے میں اپنے معاونین کا مشکور رہوں گا۔

طارق اقبال بن شاد، معرفت منشی محمود علی صاحب منتظم باپوجی لائبریری، سٹیشن روڈ، گنج بازار، نظام آباد (دکن)

خادم سیتاپوری

مرزا تقی ہوس اور خواجہ عشرت لکھنوی

قدیم لکھنؤ کے شاعروں میں میر تقی میرؔ اور میر تقی ترقیؔ کے علاوہ مرزا تقی ہوس، میرزا تقی ہوسؔ اور "آغا تقی" کے ناموں سے بھی کان آشنا ہیں؟ لکھنؤ میں کبھی "میر تقی" کا پلاؤ بہت مشہور تھا کہاوت تھی جسے منچلوں نے پورے ایک شعر میں سمو دیا تھا۔ ایک مصرع اب تک یاد ہے۔

بھوائے گا یہ "میر تقی" کا پلاؤ ہے

"میر تقی" کون تھے؟ اس کے بارے میں کوئی صحیح بات نہیں کہی جا سکتی۔ اور نہ ان "آغا تقی" کے متعلق۔ جن پر "تک بندیوں" میں عجیب عجیب طرح کی پھبتیاں کسی گئی ہیں۔!

"آغا تقی" کے باغ میں گچھا انار کا
سر کو پٹک کے مر گیا لڑکا سُنار کا

ناموں کی اس یکسانیت نے اگر ایک طرف روایتی لکھنؤ کے چند جاذب نظر نقوش چھوڑے ہیں تو دوسری طرف تاریخ ادب کے سامنے بہت سے اہم مسائل بھی کھڑے کر دیئے ہیں۔ جن میں "میر تقی ہوس" کی شخصیت اور فن بھی ایک الجھی ہوئی سی گتھی نظر آتی ہے۔ میر تقی ہوس کا ذکر عام طور سے تذکروں میں نہیں ملتا۔ ابھی تک ان کا دیوان بھی چھپا ہے۔ ہوس کے معاصرین میں میر تقی میر، میر حسن، سودا اور مرزا علی لطف وغیرہ نے "شعرائے اردو" کے بہت سے تذکرے لکھے لیکن ہوس کو سبھی نے نظر انداز کر دیا۔ ہوس کو مصحفی سے افتخارِ تلمذ حاصل تھا۔ چنانچہ اسی سیاق و سباق میں خواجہ عشرت مرحوم نے ایک واقعہ تحریر فرمایا ہے:۔

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ شیخ مصحفی کی کسی مہینے کی تنخواہ باقی تھی انھوں نے (ہوس سے) اپنی عسرت کا حال بیان کیا۔ نواب (ہوس) نے کہا آپ کی تنخواہ باقی ہے مگر مجھ سے چند روز روپیہ خرچ نہ ہو سکے گی۔ شیخ صاحب اپنی عادت کے مطابق بے ساختہ کہہ بیٹھے کہ قبلہ عالم۔ تو میری زبان بھی نہ رہ سکے گی؟ اس جملہ سے نواب (ہوس) کو سخت غصہ آیا اور باوجودیکہ ان سے مشورہ سخن لیتے تھے اسی وقت ان کو دربار سے علیحدہ کر دیا۔ چند روز تک کشیدہ خاطر رہا آخر میر حسن نے صفائی کرا دی اور تنخواہ بدستور جاری ہو گئی۔ اسی سبب سے مصحفی نے جو پہلا تذکرہ شعراء لکھا ہے اس میں ہوس کا ذکر نہیں کیا اور دوسرے میں تذکرہ لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ مصحفی نواب (ہوس) کا تذکرہ ظلم نداز ہو گیا تھا لہذا تلافی مافات کی جاتی ہے۔"

(صفحہ ۴۹۔ ماہنامہ زمانہ کانپور، جنوری ۱۹۲۹ء)

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ہوس کے متعلق جو کچھ بھی گرد پیش مناسب وہ خواجہ عشرت مرحوم ہی نے لکھا ہے حالانکہ ان کی تذکرہ نگاری میں روایات کا عنصر غالب ہے اور وہ بھی کچھ اس قسم کا کہ بعض مقامات پر "شدید تضاد" نے اصل موضوع کو مسخ کر دیا ہے۔ خصوصاً ہوس کے بارے میں ان کے یہاں ایک سب تضاد پایا جاتا ہے جس سے یہ اندازہ لگانا دشوار ہے کہ یہ میرزا تقی "ہوس" تھے کون؟

خواجہ عشرت مرحوم کا تذکرہ "آب بقا" پہلی بار فروری ۱۹۱۸ء میں نولکشور پریس لکھنؤ نے چھاپا تھا۔ اس میں صفحہ ۱۵۵ - ۱۶۰ پر "ہوس دہلوی" کے زیر عنوان ایک تفصیلی مضمون شامل ہے جس کے عنوان ہی سے ان کے "دہلوی" ہونے کا ثبوت ملتا ہے پھر اسی مضمون میں خواجہ صاحب مرحوم نے صراحت کے ساتھ بھی یہی لکھا ہے:۔

"مرزا محمد تقی خاں ہوس میر تقی میرؔ کے ہم عصر تھے، یہ اصل میں دہلی کے رہنے والے تھے اور دہلی سے فیض آباد عہد نواب شجاع الدولہ بہادر میں آئے تھے۔"

(صفحہ ۱۵۶ - آب بقا۔ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ پہلا ایڈیشن)

یہ تذکرہ فروری ۱۹۱۸ء میں پہلی بار شائع ہوا تھا اس کے بعد جنوری ۱۹۲۹ء کے ماہنامہ زمانہ کانپور میں خواجہ عشرت مرحوم کا ایک مضمون "ہوس مرحوم" چھپا۔ اس گیارہ سال کے اندر خواجہ صاحب نے غالباً ہوس کے حالات کی چھان بین کر لی تھی۔ تحریر فرماتے ہیں:۔

"نواب محمد تقی علی خاں ہوس ابن نواب مرزا علی خاں ۱۱۹۵ھ میں مکان احاطہ مرزا علی خاں محلہ حضرت سوامی خاں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔" (زمانہ کانپور، جنوری ۱۹۲۹ء)

ان متضاد بیانات سے خواجہ عشرت مرحوم پر حرف زنی مقصود نہیں ہے اور یہ ذاتی طور پر ان کی نیک نیتی کو شک و شبہ سے بالاتر سمجھتا ہوں البتہ مجھے "آب بقا" کے مقدمہ نگار مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔

"یہ کتاب جس کا نام "آب بقا" ہے لکھنؤ اور دہلی وغیرہ کے بعض شعراء کا مفصل اور جامع تذکرہ ہے۔ ان شعراء کے حالات اور مصنفوں نے بھی لکھے ہیں مگر خواجہ صاحب (عشرت مرحوم) اپنے خاص تحقیقات سے مزید حالات بہم پہنچائے ہیں۔" (ص ۶ - تذکرہ آب بقا)

خواجہ عشرت مرحوم طبعاً "روایت پسند" انسان تھے محقق نہیں تھے؟ خصوصاً ریسرچ اور تحقیق کی ان قدروں سے تو انھیں دور کا بھی لگاؤ نہیں تھا جنھیں آج کسوٹی سمجھا جاتا ہے! خواجہ صاحب قدیم لکھنؤ کی روایات پارینہ کے سیرابہ دار تھے۔ اپنے دور میں انھوں نے گذشتہ لکھنؤ پر شعرائے مرحومین کے کام نہیں کیا لیکن اس کی نوعیت ہمیشہ روایتی رہی، تحقیقی نہیں! یہی وجہ تھی کہ "تذکرہ آب بقا" میں ہوس کے متعلق انھوں نے اس قسم کے واقعات کا ذکر کرنا بھی نامناسب نہ سمجھا۔

"منشی امیر صاحب نے مجھ سے یہی بیان کیا کہ میں نے مرزا علی خاں بہادر کو دیکھا ہے وہ سعادت علی خاں کی مصاحبت میں رہتے تھے ان کی اولاد میں ہوس نہ تھے، مگر کوئی دوسرے شاعر تھے اور مرزا محمد تقی خاں بن احمد ...ے کے شعر پر تو میں جانتا ہوں وہ آتش کے شاگرد تھے ان کا تخلص مجھے یاد نہیں۔" (صفحہ ... - تذکرہ آب بقا)

"تخلص" ترک کرنے کا واقعہ ———

"پہلے آپ میر تخلص کرتے تھے۔ لیکن جب میر تقی میر لکھنؤ میں تشریف لائے اور ان کی شاعری کے ڈنکے بجنے لگے

نواب (ہوس) نے سوءِ ادبی سمجھ کر اپنا تخلص "ہوس" کر دیا جس کو ایک قطعے میں ادا کرتے ہیں۔

سن کر ہوس کے شعر کو اس شوخ نے کہا
کچھ آگے نام اور تھا یہ نام اب ہوا

(صفحہ ۱۵۱۔ تذکرہ آب بقا)

اس واقعہ کو میر تقی ترقی سے بھی منسوب کیا گیا ہے جسے نام کی "یکسانیت" کا کرشمہ سمجھنا چاہیے۔

"میر تقی ترقی بہت مشہور شاعر تھے دہلی کے رہنے والے تھے۔ نواب آصف الدولہ بہادر کے زمانے میں لکھنؤ آئے تھے۔ "میر" تخلص کرتے تھے لیکن جب ملک الشعراء میر تقی میر لکھنؤ میں آئے اور ان کی شہرت نے ترقی پکڑی تو آپ نے "سوءِ ادب" سمجھ کر اپنا تخلص بدل ڈالا اور "ترقی" کر دیا۔"

(صفحہ ۲۰۲۔ آب بقا)

اسی طرح "آب بقا" کی اشاعت کے وقت تک خواجہ صاحب مرحوم ہوس کے نسبی حالات کے بارے میں کسی صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے۔ تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس کے علاوہ وثیقے میں بھی کہیں مرزا محمد تقی خاں ہوس کا نام نہیں ہے کیونکہ بہو بیگم صاحبہ (امۃ الزہرا بیگم زوجہ نواب شجاع الدولہ۔ ہوس کی حقیقی پھوپی) نے ستر لاکھ روپیہ اپنے اعزا اور ملازمین کے وثیقے میں جمع کیا۔ اس میں مرزا علی خاں کے نام وثیقہ ہے اور ان کو اپنا بھائی بیان کیا ہے لیکن ان کی کسی اولاد کا ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح سالار جنگ کو اپنا بھائی بیان کیا ہے۔ ان کے تین بیٹے مرزا قاسم علی خاں، مرزا اکبر علی خاں، مرزا اصغر علی خاں کا ایک ایک ہزار روپیہ وثیقہ بھی لکھا ہے بلکہ ان کے متعلقین مرزا جعفر، مرزا مہتر، مرزا عباس تک کی تنخواہ درج ہے۔ ممکن ہے کہ یہ (مرزا علی خاں) مختلف البطن ہوں۔ تو بھی ہوس کا نام وثیقہ میں ضرور ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا محمد تقی خاں نواب مرزا علی خاں کے فرزند نہ تھے۔"

(صفحہ ۱۵۵۔ آب بقا)

بہو بیگم صاحبہ نے ستر لاکھ کا جو وثیقہ لکھا اگرچہ اس کی صحیح تاریخ اس وقت سامنے نہیں ہے لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ جب ان کے شوہر نواب شجاع الدولہ کا انتقال (۱۱۸۸ھ میں) ہوا۔ اور انگریز مورخین کی رنگین افسانہ طرازیوں کے مطابق آصف الدولہ نے اپنی ماں کی لوٹ کھسوٹ شروع کی تو انھوں نے اپنا کل مایہ بساط کمپنی کے سپرد کر کے یہ دستاویز وثیقہ تحریر کر دی ہوگی۔ ۱۱۸۸ھ میں شجاع الدولہ نے وفات پائی۔ آصف الدولہ سریر آرائے مسند حکومت ہوئے اور اس کے چار سال بعد ۱۱۹۲ھ میں ہوس پیدا ہوئے۔ ہو سکتا ہے وثیقہ کی یہ دستاویز ہوس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی لکھی گئی ہو۔ چنانچہ گیارہ برس کے اندر ہی جب خواجہ عشرت مرحوم کو ہوس کے نسبی حالات کی بابت کچھ اور معلومات ہوئیں تو انھوں نے لکھا:۔

"مرزا محمد تقی علی خاں ہوس مؤتمن الدولہ نواب محمد اسحاق خاں کے پوتے اور نواب بہو بیگم کے بھتیجے تھے۔ ان کے والد مرزا علی خاں کے ایک بھائی نواب سالار جنگ تھے۔ جب نواب آصف الدولہ بہادر نے لکھنؤ کو پایۂ تخت بنایا تو مرزا علی خاں بھی لکھنؤ چلے آئے اور معالی خاں کی سرائے میں اپنا احاطہ بنوایا اور وہیں مع اپنے عملے کے رہنے لگے۔ نواب سالار جنگ نے "پیر بخارا" میں اپنی املاک بنوائی۔ کالا امام باڑہ بھی انھوں نے بنوایا تھا۔ مرزا علی خاں کی قبر بھی "پیر بخارا" میں اسی کالے امام باڑہ کے قریب ہے جس پر ایک گنبد بنا ہوا ہے اور ایک قرآن خواں بھی رہتا ہے۔"

(صفحہ ۴۹۔ ماہنامہ زمانہ کانپور۔ جنوری ۱۹۲۹ء)

خواجہ عشرت مرحوم کے اس "تضاد" کو میں اُن کی دیانتدارانہ روایت نگاری سمجھتا ہوں اور ذاتی طور پر ان کی فطری اعتبار پسندی سے بھی واقف ہوں۔ مرحوم کی یہ فطری کمزوری تھی کہ ہر شخص پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کر لیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تذکرہ نگاری پر روایات کا رنگ زیادہ چڑھ گیا اور بعض جگہ عجیب عجیب قسم کا تضاد پیدا ہو گیا ہے لیکن اس کے باوجود اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہوس کے بارے میں جو معلومات خواجہ عشرت نے فراہم کر دی ہیں یکجائی طور پر شاید ہی کہیں اور مل سکیں، اور ہوس پر تحقیقی کام کرنے والے جب تذکرہ "آب بقا" اور خواجہ عشرت کے دوسرے مضمون "ہوس مرحوم" (مطبوعہ زمانہ کانپور جنوری ۱۹۲۹ء) کو سامنے رکھ کر ہوس کے حالات کا جائزہ لیں گے تو ان خاص خاص باتوں کو نظر انداز نہ کر سکیں گے۔

۱۔ ہوس ۱۱۹۲ھ میں بمقام احاطہ مرزا علی خاں محلہ سرائے معالی خاں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ (زمانہ)

۲۔ ۱۲۶۰ھ میں بعمر اڑسٹھ سال وفات پائی۔ تال کٹورے کی کربلا (لکھنؤ) میں دفن کئے گئے۔ (زمانہ)

(آب بقا میں ہے کہ سن ولادت و وفات کا پتہ نہیں چلتا۔ اتنا معلوم ہوا ہے کہ بعد وفات محلہ مفتی گنج لکھنؤ میں خاص اپنے مکان میں دفن ہوئے۔ نشان قبر اب تک موجود ہے)

۳۔ میر حسن۔ طالب علی خاں عیشی اور مصحفی ہوس کے دربار میں ملازم تھے۔ مصحفی سے شرف تلمذ بھی حاصل تھا۔ (زمانہ)

۴۔ غزل کے علاوہ ہوس نے مرثیے بھی کہے ہیں۔ (زمانہ)

۵۔ مثنوی "لیلیٰ مجنوں" (بعہد نواب سعادت علی خاں) تصنیف کی۔ (زمانہ)

خواجہ عشرت نے ہوس کا کچھ انتخاب بھی پیش کیا ہے جو زبان کی صفائی کے اعتبار سے اتنا بلند ہے کہ اس کی مثالیں شاید میر کے سوا کہیں دوسری جگہ نظر آئیں۔ میرا خیال ہے کہ ہوس کا مکمل یا نامکمل قلمی دیوان اور (غالباً) کچھ مرثیے پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب (لکھنؤ) کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔

ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد

حیدرآباد - ۱۱؍مئی، ادارۂ ادبیات اُردو کی طرف سے ۱۰؍مئی کو شام کے ۶ بجے ایوان اُردو میں پروفیسر محمد عبدالرحمٰن خاں کے سانحۂ ارتحال پر جلسۂ تعزیت منعقد ہوا۔ نائب صدر ادارہ جناب راجے جانکی پرشاد صاحب نے اس اجلاس کی صدارت فرمائی۔ پروفیسر سید محمد صاحب پرنسپل اُردو کالج نے تقریر کرتے ہوئے پروفیسر عبدالرحمٰن خاں کی موت پر گہرے رنج والم کا اظہار کیا اور کہا کہ مرحوم جب تک جیئے علم وادب کی خدمت کرتے رہے۔ عملی آدمی تھے کام سے تھکتے نہ تھے، شہرت پسند نہ ہونے کے سبب خاں صاحب اپنے کارناموں کو چمکا نہ سکے۔ اچھے انشا پرداز، عربی کے عالم فارسی کے شاعر اور ماہر فلکیات کی حیثیت سے کافی قدر ومنزلت کے حامل تھے۔

پروفیسر سید محمد کے بعد ڈاکٹر زور صدر شعبۂ اُردو کشمیر یونی ورسٹی کا بروقت بھیجا ہوا مضمون پروفیسر اکبرالدین صدیقی نے سنایا۔ ڈاکٹر زور نے خاں صاحب کی رحلت کو حیدرآباد کے لئے نقصان عظیم سے تعبیر کیا۔ کرسی صدارت سے قرارداد تعزیت پیش کی گئی جسے دومنٹ کی خاموشی اور فاتحہ خوانی کے ساتھ منظور کیا گیا۔ (وقار خلیل)

بزم ادب مئو

۱۷؍جون ۱۹۶۲ء کو ساڑھے آٹھ بجے شب میں بزم ادب مئو کی پندرہ روزہ نشست "دانش کدہ" پر زیر صدارت حضرت فضا ابن فیضی منعقد ہوئی۔ آغاز مشاعرہ سے قبل صاحب صدر نے ۱۹۶۲ء کا اشاعتی پروگرام پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ بزم ادب کی طرف سے ایک مجلہ میگزین کی صورت میں شائع کیا جائے گا اور جلد ہی ترتیب کا کام شروع ہو جائے گا۔ اس کے بعد حسب معمول مشاعرے کی کارروائی شروع ہوئی۔

(سردار شفیق - پروپیگنڈہ سکریٹری)

یوتھ اُردو ایسوسی ایشن، تاتارپور

یوتھ اُردو ایسوسی ایشن، تاتارپور بھاگل پور کی ۵۶ ویں ادبی نشست ۱۷؍جون ۱۹۶۲ء کو زیر صدارت جناب سلیمان خاں منعقد ہوئی۔ نشست کا آغاز شمس الزماں شمس کی "گفتنی" سے ہوا جس میں انھوں نے ایسوسی ایشن کی طرف سے کتابچہ نکالنے کی تجویز کو جلد سے جلد عملی شکل لانے پر زور دیا۔

اس کے بعد سلیمان خاں نے اپنے انشائیے "دو خط" سنائے۔ سید فضل رب نے ایک مقالہ "غالب کا فلسفۂ حیات" سنایا۔ علی حسن ظفر نے "بازگشت"، ایم۔ اے۔ جاوید نے "کسی کی یاد لے کر" اور محمود نے "درد کا شجر" افسانے سنائے۔ لیسین پاس نے "قطعات" سعد حمیدی نے "پنڈت گبرو جوان" خاکے سنائے۔

نظموں میں شاہین غازی پوری نے "کرسمس کی رات" محمود واجد نے "روشنی کے شہائی" سنائی۔ شمس الزماں شمس نے اپنی غزل سے نشست کا اختتام کیا۔

(تسنیم کوثر - سکریٹری)

بابل کے پانچ ہزار برس پرانے کتبوں کی تصویری تحریریں پڑھ لی گئیں

لینن گراڈ کے ایک مستشرق ایزک واٹمان نے قدیم سومیریا کے تصویری کتبوں کی عبارت کا مطلب نکال لیا ہے۔ آکسفورڈ یونی ورسٹی کے محقق پروفیسر لینگڈن نے ان قدیم کتبوں کو شائع کیا تھا۔ ابھی تک عبارت کے الگ الگ حروف، تو پڑھے جا چکے تھے لیکن ان کی ترتیب سے مفہوم نہیں بنتا تھا۔ سوویت محقق نے طویل مطالعہ اور محنت کے بعد ان کا مرتب مفہوم واضح کیا ہے، جس سے قدیم بابل کی تہذیب اور زندگی سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

مادری زبان میں تعلیم

کان پور - ۱۷؍جون - ڈائرکٹر تعلیمات اترپردیش نے انسپکٹران مدارس اور لوکل باڈیز کو اپنی ایک گشتی چٹھی میں ہدایت کی ہے کہ جن پرائمری اسکولوں میں ایسے طلبہ کی تعداد اچھی خاصی ہو جن کی مادری زبان ہندی نہ ہو۔ اور جو اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا چاہیں۔ وہاں ایسی تعلیم کا بندوبست کر دیا جائے۔

گشتی میں کہا گیا ہے کہ ایک اسکول میں چالیس اور ایک جماعت میں دس طلبہ کی موجودگی کو ایسے بندوبست کے لئے کافی سمجھا جائے۔ اور تعلیمی سال شروع ہونے سے پہلے والدین اور سرپرستوں کی درخواستیں لے لی جائیں۔

انگریزی سے ناواقف ملازمین کا مسئلہ

حیدرآباد - ۱۹؍جون، محکمۂ نظم ونسق (آندھرا پردیش) کے ایک ذمہ دار افسر نے انجمن تحفظ اُردو کو یقین دلایا ہے کہ انگریزی سے ناواقف اُردو داں ملازمین کو وظیفہ پر سبکدوشی کے لئے پریشان نہیں کیا جائے گا اور حکومت نے تمام محکمہ جات کو یہ ہدایت کی ہے کہ اس سلسلے میں ملازمین پر کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالا جائے۔

ضروری گزارش
[illegible]

از کونستنتین لیونتیف

رنگین موسیقی، ایک حیرت انگیز ایجاد

(رنگین موسیقی کے نام سے ایک مشین جو سوویت یونین میں تیار کی گئی تھی سنہ ۱۹۷۰ء میں سوویت تجارتی نمائش کے موقع پر لندن میں دکھائی گئی۔ اس مضمون کے مصنف لیونتیف نے یہ مشین ڈیزائن کی تھی۔ رنگین موسیقی کی یہ مشین اس وقت ماسکو میں نمائش کے لئے رکھی ہوئی ہے۔ مترجم)

رنگین موسیقی کی اصطلاح ہمیں آج بھی کچھ عجیب سی لگتی ہے۔ حالانکہ یہ تصور نیا نہیں۔ خود ارسطو کی قدیم تحریروں میں رنگ اور آواز کی یگانگت اور ان کے امتزاج کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے بعد بہت سے ممتاز سائنس دانوں، موسیقاروں، ادیبوں اور فنکاروں نے اس حسین تصور کے امکانات پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان لوگوں میں نیوٹن، گوئٹے، لومونوسوف جیسی سربرآوردہ ہستیاں بھی شامل ہیں۔

آواز اور رنگ کے امتزاج کا تصور نہایت دل کش ہے مگر عملی دشواریاں حائل رہی ہیں۔ آواز متحرک ہے، موسیقار اپنی مرضی کے مطابق اس میں اُتار چڑھاؤ پیدا کرتا ہے۔ موسیقار کی اُنگلیاں اور اس کے لب آواز جیسی چنچل چیز کو باندھے رکھتے ہیں، مگر اس کو جامد نہیں ہونے دیتے۔ اس میں حرکت باقی رہتی ہے البتہ ترنم آجاتا ہے۔ مصوّر جب رنگ سے آہنگ اور موزونی پیدا کرتا ہے تو وہ ایک مستقل اور ٹھوس صورت اختیار کرلیتی ہے۔ مصوّر رنگوں سے اپنے دل کی کیفیت اُتار کر کاغذ پر رکھ دیتا ہے اور وہ کیفیت دائمی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ موسیقار کا نغمہ فضا میں لہراتا ہے اور جذبات کے اُتار چڑھاؤ اور اس کی تھرتھراہٹ کو متحرک صورت میں پیش کرتا ہے۔ اس اعتبار سے آواز اور رنگ کا اسلوبِ کار اور طریقۂ اظہار جدا جدا ہے۔

مادی اعتبار سے رنگ میں جو ٹھہراؤ یا جمود پایا جاتا ہے تکنیکل ترقی کی بدولت اسے مٹانے کی صورت پیدا ہوگئی۔ ایسی مشینیں ایجاد ہوگئیں جن کی مدد سے ہر قسم کی رنگین شعاعیں پیدا کی جاسکتی تھیں، ان میں طرح طرح کے امتزاج پیدا کئے جاسکتے تھے اور پردے پر ان کا اُتار چڑھاؤ، ان کی تھرتھری اور لرزش دکھائی جاسکتی تھی۔ چنانچہ سوویت یونین امریکہ، برطانیہ اور جرمنی میں رنگین موسیقی کے تجربے ہونے لگے۔ مگر یہ تجربے زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔

اب جو مسئلہ زیر بحث آیا وہ نفسیاتی یا روحانی شعبے سے تعلق رکھتا تھا۔ سوال یہ اٹھا کہ ایک مخصوص نغمے سے جو نفسیاتی کیفیت پیدا ہوتی ہے کیا اس سے مشابہ اور مماثل کیفیت رنگوں کے ذریعہ بھی پیدا ہوسکتی ہے۔ اگر نہیں تو پھر رنگ اور موسیقی میں امتزاج اور ہم آہنگی بھی ممکن نہیں۔

مشہور روسی سائنس داں پاؤلوف نے کتوں پر جن کا تجربہ ساری دنیا میں مشہور ہوا، انسانی جسم کی ایک خصوصیت پر بہت زور دیا تھا۔ وہ یہ کہ اس میں اندرونی رابطہ اور آہنگ پیدا کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت موجود ہے۔ اس کے حواس خمسہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور جب ایک متاثر ہوتا ہے تو سب پر کچھ نہ کچھ اثر پڑتا ہے۔ روشنی اور رنگ کا اثر سماعت پر اور آواز اور نغمہ کا اثر دیکھنے کی قوت و صلاحیت پر پڑتا ہے۔ دورِ حاضر کے سائنس داں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔

چناں چہ یہ طے کیا گیا کہ رنگ اور موسیقی میں رابطہ اور آہنگ قائم کرنا ممکن ہے، کیونکہ انسان کے اعصاب اور اس کے حواس دونوں محرکوں سے اس طور پر متاثر ہوتے ہیں کہ ان کی حد بندیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔

اب ماہرین کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ رنگین موسیقی پیش کرتے وقت آواز اور رنگ میں فنی مطابقت یا آہنگ کیسے پیدا کی جائے۔ ماہرین نفسیات، ماہرین عضویات، روشنی کی لہروں کے ماہر اور الکٹرونک سائنس عالم اس نتیجے پر پہنچے کہ انسان کی دیکھنے اور سننے کی قوت اور اعضا کا اس طرح مطالعہ اور تجزیہ کرنا ہوگا کہ آواز کو رنگ کی زبان میں ترجمہ کیا جاسکے۔ چناں چہ اس میدان میں تحقیق ہوئی اور اس کے نتیجے میں رنگین موسیقی کی مشین ایجاد ہوئی۔

علم کا پردہ سامنے ہے، ناظرین و سامعین بیٹھے ہوئے ہیں اسٹیج پر ایک شخص نے وائلن کا تار چھیڑا اور پردے پر رنگ کی لہریں نمودار ہوئیں۔ نغمے کا سُر بدلا اور رنگ بدل گئے یکایک نہیں بدلے بلکہ نغمے کی لہروں پر آہستہ آہستہ رنگ میں اُتار چڑھاؤ پیدا ہوا۔ رنگ بھی موسیقی کے ساتھ لہریں لے رہا تھا اور شوخ اور مدھم ہوتا تھا، سادہ اور نوع بہ نوع ہوتا تھا اور لوگ کان سے آواز کا نغمہ اور آنکھوں سے رنگ کا نغمہ سُن رہے تھے!

مشین اس قسم کی ہے کہ موسیقی کی آواز ایک مائکروفون میں جاتی ہے۔ پھر وہ ایک الکٹرونک مشین میں پہنچتی ہے جہاں اس کا برقی تجزیہ ہوتا ہے اور وہیں آواز کے مطابق رنگوں کا فیصلہ ہوجاتا ہے اور پھر منتخب رنگوں کی شعاعیں پردے پر آتی ہیں۔ مگر یہ مشین سب کچھ طے نہیں کرتی۔ موسیقی اور رنگوں کے حُسن کا ماہر اپنی جمالیاتی قوت سے مدد لے کر رنگوں میں ذرا ذرا سی اصلاح کرتا جاتا ہے۔ یہ خیال غلط ہوگا کہ رنگین موسیقی میں رنگ کی جمالیات مشین کے ماتحت ہوگئی ہے۔

رنگین موسیقی ابھی بچپن کی منزل میں ہے، مگر ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات نظر آنے لگے ہیں۔

معاصر

اُردو کا مسئلہ

اُردو کا مسئلہ اب ذہول اور خاموشی کی اس منزل پر پہنچ گیا ہے کہ اس میں بظاہر حرکت کے کوئی آثار نظر نہیں آتے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اس مریض جاں بلب کو دوا کے بہانے اتنا ٹالنا چاہتی ہے کہ اس کی قوتِ حیات خود بخود ختم ہو جائے، چناں چہ ۱۴ سال کے عرصے میں وہ حکومت کے تمام شعبوں سے رفتہ رفتہ خارج ہو چکی ہے۔ حکومت جو وعدے کرتی ہے ان کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی اس لئے وہ بے نتیجہ ہیں، اگر کوئی معمولی رعایت دیتی بھی ہے تو ایسی پیچیدہ شکل میں کہ جس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا اور اگر اس کی گنجائش نکلتی بھی ہے تو حکومت کے اُردو دشمن عمال طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُردو روز بروز ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اگر چند دنوں اور یہ صورت قائم رہی تو اُردو پڑھنے والے ہی نہ رہ جائیں گے اور اس کا قصہ ہی ختم ہو جائے گا اور حکومت کو بھی اس دردِ سر سے نجات مل جائے گی۔

اُردو کا مسئلہ قومی اتحاد و یک جہتی کے نقطۂ نظر سے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، بے وجہ اُردو دشمنی کا تو کوئی جواب نہیں، لیکن اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو اُردو صدیوں سے قومی اتحاد و یک جہتی کی جو خدمت انجام دیتی چلی آ رہی ہے، اس میں ہندوستان کی کوئی زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، وہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے الفاظ، ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی روایات کا رنگا رنگ گلدستہ ہے، اس کی صرف و نحو ہندی کی، روزمرہ کی بول چال کے بیشتر الفاظ ہندی و سنسکرت کے، علمی و تمدنی الفاظ و اصطلاحات بیشتر عربی و فارسی بلکہ انگریزی کے بھی ہیں، اُردو کو ہندو و مسلمانوں نے مل کر پروان چڑھایا ہے۔ کوئی دور ایسا نہیں ہے جس میں اُردو کے بڑے بڑے ہندو ادیب، شاعر اور مصنف و اہلِ قلم نہ رہے ہوں، اس کے ادبی سرمائے میں ہندو مسلمان دونوں کے مذہبی و تہذیبی روایات کا ذخیرہ ہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں اُردو کی رجزیہ نظموں نے جتنا کام کیا ہے ہندوستان کی کسی زبان نے نہیں کیا ہے۔ "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ فرقہ پرست جماعتوں کی زبان سے بھی نکل جاتا ہے اس لئے کہ اس میں جو زور و قوت ہے وہ ہندی کے کسی نعرے میں نہیں ہے۔

اس کی مقبولیت اور آل انڈیا حیثیت یہ ہے کہ اُردو ہی ہندوستان کے مختلف خطوں کے باشندوں میں تعارف کا ذریعہ ہے، اس کے سوا ہندوستان کے کسی صوبے کی زبان دوسرے صوبے میں کام نہیں دے سکتی جو لوگ اُردو نہیں جانتے وہ دوسرے صوبوں کے لئے بالکل اجنبی ہوتے ہیں، لیکن اُردو بولنے اور سمجھنے والے کے لئے کوئی صوبہ اجنبی نہیں، بلکہ ہندوستان کے باہر اس کے پڑوسی ملکوں میں بھی اُردو کے ذریعے کام چل جاتا ہے اس کے مقابلے میں ہندی کے جبریہ تسلط کے باوجود خود اس کی راجدھانی میں نومولود ہندی سمجھنے والے بس خال خال ہیں اور ہندی کے جبریہ تسلط نے اتحاد و یک جہتی کے بجائے مختلف صوبوں میں اس کے خلاف بغاوت پیدا کر دی ہے جس سے ہندوستان کی سالمیت خطرے میں پڑ گئی ہے اس لئے اُردو کو مٹانا درحقیقت قومی اتحاد و یک جہتی کے ایک بہت بڑے وسیلے کو مٹانا ہے مگر اس پر وہی لوگ ٹھنڈے دل سے غور کر سکتے ہیں جو لسانی مسائل کو سیاسی عینک سے نہیں بلکہ خالص لسانی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔

(معارف۔ جون ۱۹۶۳ء)

انجمن کی نئی کتاب

ظاہر و باطن

(مزاحیہ ڈراما)

از

محمد فضل الرحمٰن

خوبصورت ٹائٹل۔ آفسیٹ کی طباعت

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ۱۰۴ صفحے

قیمت ایک روپیہ پچیس نئے پیسے

انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ

انجمن کی تازہ کتاب

دیمک کی کہانی

جو صرف دیمک کی زندگی اور خواص کے لحاظ سے دل چسپی کا باعث ہے بلکہ اقتصادی اعتبار سے بھی کافی اہمیت رکھتی ہے۔

مصنفہ: ڈاکٹر عبدالبصیر خاں

سائز ۲۰×۳۰ - ۱۴۳ صفحے

قیمت۔ دو روپئے

انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ

ڈاکٹر وحید مرزا

اُردو انسائیکلوپیڈیا

اُردو دائرۂ معارف اسلامیہ (جلد اوّل)

مطبوعہ زیر اہتمام دانش گاہ پنجاب، لاہور، (۱۹۶۲ء)

ص ۱ تا ۸۳۰، کراسہ ۱ تا ۱۷۔

اب سے گیارہ بارہ سال پہلے دانش گاہ پنجاب، لاہور کے ارباب حل و عقد کو یہ خیال آیا کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM) کے نام سے جو کتاب انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں لائیڈن سے ۱۹۰۸ء۔ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی تھی اس کا اُردو ایڈیشن تیار کیا جائے تاکہ وہ لوگ جو ان یورپین زبانوں سے ناواقف ہیں لیکن اسلامیات میں دلچسپی رکھتے ہیں ان مفید معلومات سے جو اس کتاب میں مندرج ہیں بہرہ یاب ہو سکیں اور اُردو ادب میں ایک نہایت ضروری اضافہ بھی ہو جائے۔ چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے دانش گاہ نے ایک علیحدہ شعبہ قائم کر دیا جو شعبۂ اُردو دائرۂ معارف اسلامیہ کہلاتا ہے اور اس شعبہ کی نگرانی اور اس کا نظم و نسق ستارۂ پاکستان خان بہادر پروفیسر محمد شفیع صاحب سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور کے سپرد کیا گیا۔ انھوں نے ایک ادارۂ تحریر (ایڈیٹوریل بورڈ) کی مدد سے جس میں کئی قابل آدمی شامل رہے ہیں، بہت تندہی اور جاں فشانی سے کام شروع کر دیا۔ پاکستان اور ہندوستان کے متعدد ماہرین اسلامیات کو ترجمے کا کام سونپا گیا اور ان لوگوں کے کئے ہوئے ترجموں کی تصحیح کے لئے دوسرے ماہرین کی خدمات حاصل کی گئیں۔ انگریزی ایڈیشن چار جلدوں اور ایک ضمیمے پر مشتمل تھا، اور قبل اس کے کہ ترجمے کا کام زیادہ آگے بڑھ سکے انگلستان میں ایک نئے اور ترمیم شدہ ایڈیشن کی تیاری مکمل ہو گئی اور کچھ ہی عرصے بعد شروع کے کراسے (فیسکیولز) شائع ہونے لگے۔ اندریں حالات مناسب یہ معلوم ہوا کہ حرف الف و ب یعنی انگریزی حرف A و B سے شروع ہونے والے مادّوں کی اشاعت فی الحال روک دی جائے، اور طباعت و اشاعت کی ابتدا حرف ت سے کی جائے تاکہ الف و ب کے مادّوں کے لئے نئے انگریزی ایڈیشن سے استفادہ کیا جا سکے۔ اس نئے ایڈیشن کے کراسے جیسے ہی شائع ہو کر پہنچتے رہے ویسے ہی ان کا بھی ترجمہ شروع کر دیا گیا اور ادھر حرف ت کے مادّوں کی تکمیل اور اشاعت کا کام جاری رہا۔

اُردو دائرہ معارف کی اس پہلی جلد کا پہلا کراسہ جون ۱۹۵۹ء میں چھپ کر تیار ہو گیا تھا، اور آخری یعنی سترھواں مارچ ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا جس کی اشاعت سے جلد اوّل مکمل ہو گئی ہے۔ ان سترہ کراسوں میں سے پہلے سولہ چوالیس چوالیس صفحات پر مشتمل ہیں اور سترھواں صرف ۴۸ صفحوں پر۔ اس جلد کے بعد آئندہ کراسے حرف الف سے شروع ہوں گے اور باقی جلدوں میں اُردو الف باء کی ترتیب ملحوظ رکھی جائے گی۔ کراسے بڑے سائز کے چکنے اور نفیس کاغذ پر، جسے ایشیا فاؤنڈیشن نے دانش گاہ پنجاب کو تحفۃً دیا تھا، طبع ہو رہے ہیں۔ ہر صفحے میں دو جدول (کالم) ہیں اور ہر جدول ۴۰ سطروں پر مشتمل ہے۔ ٹائپ کے حروف جلی اور خوبصورت ہیں اور طباعت میں صحت کا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔ بعض غلطیاں جو اس پر بھی رہ گئی ہیں ان کی تصحیح کے لئے ہر کراسے کے آخر میں ایک غلط نامہ بڑھا دیا گیا ہے۔ پہلے کراسے کے شروع میں رموز (SYMBOLS) اور اختصارات (ABBREVIATIONS) کی ایک فہرست دی گئی ہے اور ان علامات (SIGNS) کی بھی تشریح کر دی گئی ہے جنھیں کتاب میں جگہ جگہ استعمال کیا گیا ہے۔

دائرۂ معارف اسلامیہ کے اس ایڈیشن کو محض انگریزی ایڈیشن کا اُردو ترجمہ تصور نہ کرنا چاہئے، اس لئے کہ اس میں کئی ایسے مادّوں کا اضافہ کیا گیا ہے جو انگریزی ایڈیشن میں موجود نہ تھے، علاوہ ازیں انگریزی ایڈیشن میں جہاں کہیں کوئی مقالہ یا مواد اسلامی عقیدے یا نقطۂ نظر کی رو سے قابل اعتراض تھا اسے یا تو حذف کر دیا گیا ہے اور یا اسے اسلامی عقیدے کے مطابق لکھا گیا ہے نیز ان حوالوں کا جو اس ایڈیشن میں پائے جاتے ہیں اصل کتابوں سے مقابلہ کر کے جائزہ لیا گیا ہے اور جہاں بھی کوئی غلطی نظر آئی اس کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ اسی طرح ان انگریزی عبارتوں کا جو عربی، فارسی یا ترکی متون سے ترجمہ کی گئی تھیں اصل عبارتوں سے مقابلہ کرنے کے بعد اُردو ترجمے میں جابجا ترمیم کی گئی ہے جس سے اس کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ انہی سب وجوہ کی بنا پر امید ہے کہ دانش گاہ پنجاب اور کارکنان ادارۂ تحریر کی یہ علمی و ادبی سعی برصغیر ہند و پاکستان کے اُردو داں طبقے میں قدر و استحسان کی نظر سے دیکھی جائے گی اور اس کتاب کو ہر دانش گاہ اور ہر تعلیمی ادارے کی لائبریری میں ایک باعزت جگہ حاصل ہوگی جس کی وہ یقیناً مستحق ہے۔

اورینٹل کالج بمبئی کے سالانہ امتحانات

کالج کے سالانہ امتحانات شعبۂ اُردو ۲۷ راگست ۶۲ء اور شعبۂ اسلامیات ۳ر ستمبر ۶۲ء سے شروع ہوں گے

دستور و نصاب منگوانے کا پتہ

پرنسپل اورینٹل کالج بھنڈی بازار بمبئی ۳

پبلشر نذیر حسن پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا